مستشرقین اور قرآن کریم

محمد مصطفی الاعظمی

[عصر حاضر کے معروف علوم الحدیث کے ماہر ڈاکٹر مصطفی الاعظمی صاحب نے Toby Lester کے مضمون میں اٹھائے گئے شبہات کا جامع اور مدلل جواب لندن کے جریدے *Impect International* میں کئی اقساط میں تحریر فرمایا ہم شکریہ کے ساتھ اس کا ترجمہ اپنے قارئین کے لیے پیش کر رہے ہیں۔]

اسلام کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لاشریک، آقا، مالک، کائنات کا خالق اور ہر چیز کا پالن ہار ہے۔ وہ دانا، مہربان، انصاف کرنے اور سیدھا راستہ دکھانے والا ہے۔ اس کا علم لامحدود، اس کی رہنمائی ابدی اور زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہے۔ وہ علیم وخبیر ہی جانتا ہے کہ ہم انسانوں کے لیے کیا اچھائی اور کیا برائی ہے۔ وہ قادرِ مطلق اور بے نیاز ہے۔ اس نے ازل سے ہی اپنے تربیت یافتہ انبیاء اور پیغمبر لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجے تاکہ لوگوں کے سامنے نیکی اور اچھائی کی مثال پیش کی جاسکے اور انہیں برائی اور بدی سے آگاہ کیا جاسکے، انہیں دنیا اور آخرت میں نیکی کے ثمرات اور گناہ کے عذاب سے خبردار کیا جاسکے۔

اس کا اپنے بندوں پر فضل وکرم منطقی طور پر اس ہدایت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ محفوظ رہنے والے قرآن کریم اور انسانیت کے لیے کتاب ہدایت کی صورت میں نازل کیا گیا۔ قرآن کریم لوگوں کو سوچنے اور اپنی جانب متوجہ ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے خیر اور شر میں واضح تفریق کردی ہے، اب یہ انسانوں پر ہے کہ وہ جو بھی راستہ اختیار کریں۔

یہ بات مکمل طور پر قابل فہم ہے کہ جب غیر مسلم قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہیں [خواہ ان کا مقصد

---

* Prof. Muhammad Mustafa al-Azmi, "Orientalists and The Quran", *Impact International,* London, January 2000, pp. 23-25, March 2000, pp. 26-28, May 2000, pp. 26-27

جو بھی ہو] تو ان کے لیے [غیر مسلم ہونے کے ناطے] لازم نہیں کہ وہ [مسلمان کی طرح] حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن پاک کے وحی الٰہی اور آخری کتاب ہونے پر بھی ایمان رکھتے ہوں۔ چنانچہ انہیں تنقید و تنقیح اور استرداد کا حق ہے۔ تا کہ وہ اپنے لیے خود فیصلہ کر سکیں۔ لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جب ایسے لوگ نہ تو سمجھنے کی حقیقی خواہش رکھتے ہوں نہ ایسا کرنے کی کوئی معروضی اور غیر جانبدارانہ کوشش کریں اور پھر بھی اپنے عجیب و غریب نظریات پیش کر کے سب سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ان کے جاہلانہ تصورات اور ناقص و مجہول علم و فضل سے متاثر ہو جائیں گے۔ اس بات کی مضحکہ خیزی میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اسلام کو مسلمانوں سے زیادہ سمجھتے ہیں اور اگر مسلمان اپنے دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ مستشرقین کے تشریح کردہ اسلام کی پیروی کریں۔

ایسی ہی ایک کوشش، جو کسی طرح بھی پہلی نہیں ہے، ایک امریکی صحافی ٹوبی لیسٹر (Tobi Lester) نے امریکہ سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالے *The Atlantic Monthly* کے جنوری ۱۹۹۹ء کے شمارے میں "What is the Koran?" مضمون لکھ کر کی ہے۔ مختلف رسائل اور اخبارات میں بائبل کو نئے انداز اور نئے زاویے سے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو تاریخ کے حوالے سے سمجھنے کی کوششوں پر مبنی مضامین اس کی نظر سے گزرتے رہتے تھے۔ لہٰذا اسے اس بات پر حیرانی ہوئی تھی کہ کوئی قرآن کو بھی نئے زاویوں اور پیمانوں سے سمجھنے کے لیے کی جانے والی کوششوں پر مضامین کیوں نہیں لکھ رہا؟

ایک متجسس صحافی، جیسا کہ وہ ہے، ٹوبی لیسٹر نایاب کتب کی دستیابی کے حوالے سے مشہور ایک لائبریری میں گیا اور پھر اس دعویٰ کے ساتھ واپس آیا کہ ''اس نے جو کچھ تلاش کیا ہے، اسے وہ متوازن اور غیر جانب دارانہ انداز میں بیان کرنے کی پوری کوشش کرے گا''۔ اسی اثناء میں اسے معلوم ہوا کہ جرمن یونیورسٹی کے دو اساتذہ ڈاکٹر جیرڈ آر جوزف پوئن (Dr. Gerd R Joseph Puin) اور ڈاکٹر ہانز کیسپر گراف وان بوتھمر (Dr. Hans-Casper Graf von Bothmer) کو قرآن پاک کے کچھ ایسے بوسیدہ اوراق ملے ہیں، جن کا تعلق پہلی یا دوسری صدی ہجری کے زمانے سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ اوراق کے ٹکڑوں میں آج کے مستند قرآنی مصحف سے کسی قدر انحراف پایا جاتا ہے۔ مسٹر ٹوبی

لیسٹر نے سوچا کہ یہ بات مسلمانوں کے لیے تو تکلیف دہ ہوسکتی ہے، لیکن ان لوگوں کے لیے بہرحال دلچسپی اور کشش کا باعث ہوگی جو نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہب کے لیے کام کر رہے ہیں۔ 'اصلاح مذہب' کی ویسی ہی ایک تحریک، جس کا سامنا اس سے پہلے عیسائیت کر چکی ہے۔

ٹوبی لیسٹر کے اندر کے صحافی نے سوچا کہ ایک بہت دلچسپ کہانی اس کے ہاتھ لگ گئی ہے، اور وہ فوراً اسے شائع کرانے کے لیے دوڑا۔ مسلمانوں کے لیے اس کہانی میں کوئی نئی بات اس لیے نہ تھی کہ وہ روز اول سے ایسی کہانیاں سنتے آئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اشتراکیت کے خلاف سرد جنگ میں کامیابی کے بعد، مغرب میں قدیم ''اسلام فوبیا'' کے تحت یہ سوچ پیدا ہو چکی تھی کہ 'اب وقت ہے کہ ''پرانے دشمن''، یعنی اسلام سے بھی نپٹ لیا جائے'۔ محاورے کے مطابق عوام کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، اور تاریخ کی یادداشت شاید اسے بھی کمزور ـــــ اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم قرآن اور حدیث پر مستشرقین کے چند اہم قدیمی اعتراضات کو دوہرا لیں۔

مستشرقین نے قرآن کریم پر جو اعتراضات کیے ہیں، انہیں کسی منطق سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ وہ اعتراض برائے اعتراض کی ذیل میں آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن زبانی ہی کیوں نازل ہوا اور پھر اکٹھا کیا گیا۔ اور یہ کہ کوئی بھی چیز جو زبانی ہو قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔ پھر جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے تحریری شکل میں محفوظ کرا دیا کرتے تھے، تو اس بات پر بھی وہ جھٹ سے اعتراض جڑ دیتے ہیں۔ یہ لوگ دور اول میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اکٹھا کیے جانے والے تحریری اثاثے پر بھی بلا تکلف اعتراض وارد کر دیتے ہیں۔

کچھ مستشرقین خلیفہ سوم سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس کارنامے کا اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کے تمام نسخوں کو جمع کر کے چار (اور بعض روایتوں میں سات) مستند اور مصدقہ نسخے سرکاری طور پر منظور کیے اور پھر انہیں مرکزی شہروں میں بھیجا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مستشرقین یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ یہ کام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحلت کے پندرہ برس بعد ہوا، اس لیے ان کے خیال میں قرآن کا متن متاثر ہوا ہوگا۔ حالانکہ خود عہد نامہ قدیم کی کچھ کتب تو پانچ سے آٹھ سو برس تک زبانی روایت کے بل پر اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی رہی تھیں۔ اس کے برعکس اہل علم و دانش نے اس حقیقت کو واضح

کیا ہے کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو 'جامع القرآن' صرف ان معنوں میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلم امہ کو قرآن کے ایک مصحف (نسخے) پر اکٹھا کیا، اور کھلی اسمبلی منعقد کر کے اس کی تصدیق کی۔ اس ضمن میں انہوں نے اسی نسخے پر انحصار کیا جو خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذریعے ان تک پہنچا تھا۔

مستشرقین نے اپنے فہم کے مطابق عربی کے ابتدائی تلفظ و اِملا (orthography) میں غلطیاں تلاش کیں۔ جس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قرآن کی آیات لکھنے اور پھر انہیں پڑھنے میں غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ تاہم نزول قرآن سے پہلے عربی میں کتاب لکھنے کا عام طور پر کوئی رواج نہیں تھا۔ جنہوں نے اس وقت کچھ لکھا بھی، خصوصاً شاعری، انہوں نے بھی اسے زبانی روایت کے مطابق ہی تحریر کیا۔ اس وقت تحریر و تقریر کی زبان میں فرق نہ ہونے کی بنا پر لفظی ترنم اور تلفظ یا صرف و نحو میں کچھ فرق کا ہونا بالکل معمول کی بات تھی۔ ویسے بھی اس وقت تک عربی میں جملہ رموز واوقاف اور اعراب کے استعمال کا رواج نہیں تھا، اس لیے ان کا استعمال بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا، یہ ضبط تحریر میں لایا جاتا رہا۔ اس کے ساتھ قرآن کے کتابی نظم وضبط اور زبان کی دوسری ضروریات کے زیر اثر خود عربی زبان کی تحریر میں بھی پختگی آتی چلی گئی۔

چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے صرف پچاس برس کے اندر اندر عربی رسم الخط اس قدر معیاری بن چکا تھا کہ ابتدائی تلفظ و اِملا کے فرق اور مشکلات پر قابو پایا جا سکے۔ اس عمل نے ایسے رسم الخط کو فروغ دیا جو قرآن پاک کے متن کی وضاحت کر پائے۔ جیسا کہ بعض مستشرقین کا بھی خیال ہے کہ قرآن نے عربی زبان میں تلفظ کا تعین اور وضاحت کر دی ہے۔ تاہم مستشرقین اس خیال کو بھی عام کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ''عربی زبان کو قرآن کی عربی سے علیحدہ کیا جائے اور عربی زبان اپنے مختلف علاقائی لہجوں میں ہی سمجھی جانی چاہیے نہ کہ اسے قرآن کی معیاری زبان کا پابند بنایا جائے''۔

مستشرقین کا اصرار اس بات پر رہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں قرآن پاک کے ایک مستند مصحف کی تیاری میں پندرہ سال کا وقفہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ اتنا طویل عرصہ ہے کہ قرآن پاک کا متن متاثر ہو سکتا تھا۔

قرآن کریم کے یہ ناقدین اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن پاک دونوں یعنی زبانی اور

تحریری شکلوں میں بیک وقت محفوظ کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو قرآن کو تحریر کیا جا رہا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری جانب اسے حفظ بھی کیا جا رہا تھا۔ قرآن پاک کو محفوظ اور شائع کرنے کا یہ دوہرا حفاظتی نظام تھا، جس نے قرآن پاک میں غلطی کے امکان کو ختم کر دیا۔ جب اسے لکھا گیا اور حفظ کیا گیا تو پھر اگر الفاظ اوران کی ادائیگی کا کوئی فرق تھا بھی تو وہ مکہ کے تلفظ میں قرآن پاک کی جمع وتدوین کے بعد غیر اہم، بلکہ ختم ہوکر رہ گیا۔

جو لوگ کسی ایسی الہامی کتاب کے قائل ہی نہیں ہیں جس میں ہمیشہ کے لیے نوع انسانی کی راہنمائی کا سامان موجود ہو، وہ کسی صورت اپنی اصلاح کے لیے تیار نہیں۔ کچھ لوگوں نے قرآن پاک کو زبانی (بذریعہ حفظِ قرآن) دوسرے لوگوں تک منتقل کرنے میں کوئی خرابی تلاش کی، اور کچھ لوگوں کو قرآن پاک قلم بند کرنے میں خامی نظر آئی۔

اسی طرح دوسری جانب یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ عبرانی رسم الخط دو مرتبہ تبدیلی کے عمل سے گزرا ہے۔ عبرانی رسم الخط نے پہلے اس وقت شکل تبدیل کی جب یہودی بابلیوں (Babylonian) کی غلامی سے آزاد ہو کر فلسطین (Philistine) پہنچے۔ نیا رسم الخط بھی اگرچہ ان کی ضروریات کے لیے ناکافی ثابت ہوا تاہم یہ آئندہ دو ہزار برس تک برقرار رہا۔ مسلمانوں سے میل جول اور رابطے کے بعد ہی یہودی اس قابل ہوئے کہ عبرانی رسم الخط کو معیاری (standardise) بنا سکیں۔

ہمارے پاس آج بھی قرآن پاک کے وہ نسخے محفوظ ہیں، جن کا تعلق پہلی صدی ہجری سے ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ کب اور کن تاریخوں میں وہ نسخے مرتب ہوئے۔ لیکن مستشرقین کے مطابق ''یہ نسخے اتنے عرصے بعد میں مرتب ہوئے ہیں کہ انہیں قابل اعتبار نہیں قرار دیا جا سکتا''۔ جبکہ گریگوری کیلنڈر کے مطابق ابتدائی انجیل (Gospel) کا تعلق نویں صدی سے اور عہد نامہ عتیق کا دسویں صدی سے تھا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں تحصیل علم کا یہ ایک ضروری حصہ سمجھا جاتا تھا کہ حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کا علم دوسرے افراد تک وہی لوگ منتقل کریں، جنہوں نے ان کا علم اصل ماخذ اور اولین دور کے اساتذہ سے حاصل کیا ہو۔ اس احتیاط اور احساس ذمہ داری کے باعث فارغ التحصیل طلباء کی سند فضیلت پر ان کے ہر استاد کے تعلیمی شجرہ کی تفصیل لکھنے کا نظام وجود میں آیا، جو آج تک برقرار ہے۔ یوں طالب علم کا

تعلق اساتذہ کے ایک ایسے نہ ٹوٹنے والے سلسلے سے قائم ہو جاتا تھا جو اسلام کے ابتدائی دنوں تک جاتا۔ لہٰذا جعلی اسناد کے اجرا یا کسی نقلی گریجویٹ کے درآنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسلامی تاریخ میں ان لوگوں کی تعداد لاکھوں میں تھی، جنہوں نے ذاتی طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل کیا اور جن کے سامنے روزمرہ کے معاملات کے بارے میں اسلام کی جانب سے رہنمائی وقوع پذیر ہوتی رہی۔ اجتماعی زندگی کے ان لحہ بہ لحہ مسائل پر وہ ایک دوسرے کے سامنے اپنی یادداشتوں اور تحریروں کا موازنہ کرتے تھے اور جتنا ممکن ہوتا، صداقت اور درستی سے علم، فہم اور تجربہ دوسروں تک منتقل کرتے تھے۔ یہ لوگ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی تھے، جو اس علم کو سیکھنے اور محفوظ کرنے میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔

وہ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اپنے پاس سے کسی چیز کا اضافہ کرنے یا اپنی مرضی سے اس کی نفی کرنے یا اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر سے غلط منسوب کرنے کا مطلب اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرد ود و مقہور بنا لینے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود ہر راوی کی اہلیت اور اس کے مکمل قابلِ اعتبار ہونے کے بارے میں کڑی چھان پھٹک کی جاتی، پھر روایات کی صداقت جاننے کے لیے ان کو غیر جانبدارانہ انداز میں پرکھا جاتا، اور قرآن پاک کی جملہ تعلیمات سے موازنہ کیا جاتا۔ اس طرح اسلامی ماخذ کو ابتدائی دنوں سے ہی محفوظ کر کے لوگوں تک پہنچا دیا گیا۔ صداقت اور درستی کا یہ معیار جو ابتدائی مسلمان علماء نے قائم کیا تھا، آج بھی دنیا بھر کے نظام ہائے تعلیم میں ایک لاثانی مثال ہے۔ یہ مثال اتنی قابل تحسین ہے کہ کسی ''کافر'' ذہن کے لیے اسے سچ تسلیم کرنا دشوار ہے۔ چنانچہ کچھ مستشرق اس کو استہزائیہ انداز میں ''سالویشن ہسٹری'' (تاریخ نجات) کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔

یہاں پر عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید کے ساتھ موازنہ، شاید اس حقیقت کو واضح کرنے میں مدد دے گا کہ اسلامی ماخذ کی اصلیت، سچائی اور صحت کو محفوظ رکھنے کے لیے کس قدر احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کی تمام کتب کے مرتبین کے احوال و آثار کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ تاریخ میں یہودیت اور عیسائیت بطور مذاہب موجود ہیں، لیکن ہم کسی کو عہد نامہ عتیق کا مسلّمہ مصنف نہیں کہہ سکتے۔ ابتداء میں اسے ایک الہامی کتاب سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں یہ کہا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ

السلام کی لکھی ہوئی ہے۔لیکن اس بارے میں اب جدید نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ عہد نامۂ عتیق کو بہت سے مصنفین نے کئی ہزار سالوں کے عرصے میں قلم بند کیا۔اور یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب پانچ کتابوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

ہم ان مصنفین کی تعلیمی قابلیت، اہلیت اور احوال زندگی کے بارے میں نہایت معمولی معلومات رکھتے ہیں اور جملہ تفصیلات سے بے خبر ہیں۔ہمیں نہیں معلوم کہ مذکورہ واقعات کے بارے میں ان کا علم کیا تھا؟، کیا وہ محض تماشائی تھے یا وہ ان واقعات میں عملاً شریک بھی رہے؟ تاریخی حوالے سے وہ ان واقعات کے کتنا قریب یا دور تھے؟ کیا ان کی یادداشت اچھی تھی؟ وہ کتنے سچے، پاک باز اور کتنے غیر جانب دار اور کس قدر احتیاط برتنے والے لوگ تھے؟ سماجی زندگی میں کیا وہ معتبر اور مستند لوگ سمجھے جاتے تھے؟ اور یہ کتابیں آج ہم تک کن کن وسیلوں اور ذریعوں سے پہنچی ہیں؟ جس واحد چیز کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عہد نامۂ عتیق کی کتابیں منظر عام پر آئیں اور پھر چند سو سالوں کے لیے غائب ہوگئیں۔پھر کچھ چیزیں منظر عام پر آئیں جنہیں مستند قرار دے دیا گیا۔اور پھر یہ کئی سو سالوں کے لیے غائب ہوگئیں، آخر کار ان کو اچانک دوبارہ دریافت کرلیا گیا۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ تورات اور زبور الہامی کتابیں ہیں، جو بالترتیب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئیں، لیکن وہ گم ہوگئیں۔موجودہ عہد نامۂ عتیق کے کچھ حصوں میں اصل وحی کا مفہوم ہوسکتا ہے لیکن سب کچھ اتنا گڈمڈ ہوگیا ہے کہ اب اصل مواد سے اضافہ شدہ مواد کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ان کی صداقت کو تسلیم کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ جہاں قرآن کے پیغام سے موافقت ہو، وہاں انہیں وحی سے قریب تر مان لیا جائے۔

علم و تحقیق کے میدان میں جب کوئی نظریہ پیش کیا جاتا ہے، تو اس کی صداقت اور معقولیت متعین کرنے کے لیے اس کو معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں پرکھا جاتا ہے۔اگر وہ نظریہ ناکام ہو جاتا ہے یا اس میں کوئی کمی بیشی رہ جاتی ہے تو اس کو تبدیل یا درست کرلیا جاتا ہے یا مکمل طور پر ترک بھی کر دیا جاتا ہے۔مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جب اسلام کی بات آتی ہے تو اس کے بارے میں نیم پختہ، غیر مصدقہ اور غیر مستند نظریے کو بھی مغرب میں آنکھیں بند کر کے قطعی صداقت کے طور پر قبول کرلیا جاتا ہے، چاہے اس

کے کذب وافترا، کج روی اور بودے پن کو دو اور دو چار کی طرح غیر جانب دارانہ اور فیصلہ کن انداز میں واضح بھی کر دیا جائے۔ معروضیت اور عدم تعصب کے علم بردار یہ مستشرقین کبھی اس قسم کے جھوٹے نظریات کو پھیلانے سے باز نہیں آتے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک مشہور اور مستند حدیث بیان کی گئی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر استوار ہے۔ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پانچ وقت نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان میں روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ لیکن پروفیسر وینز نک (Wensinck) اس حدیث کو اس لیے خود ساختہ قرار دیتا ہے کیوں کہ اس میں کلمہ شہادت کے الفاظ موجود ہیں۔

وینز نک کے خیال میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شام میں عیسائیوں سے ملنے کے بعد کلمہ وضع کیا، جن کا اپنا ایک کلمہ تھا۔ مگر اس خود ساختہ نظریے میں ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ کلمہ شہادت، تشہد کا ایک حصہ ہے، جو کہ پانچ وقت کی نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کو کسی سے ادھار لینے یا نقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وینز نک اپنے اس بے بنیاد نظریے (theory) کی اصلاح کرتا اس نے ایک اور نظریہ پیش کیا اور وہ یہ کہ نماز کا معیار (طریقۂ کار) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قائم کیا گیا اور اس طرح سے کلمہ شہادت کو تشہد میں شامل کر کے نماز کا حصہ بنا دیا گیا۔ (A.J. Wensinck, *Muslim Creed, Cambridge,* 1932. p 19-32.) اس سب کے باوجود مسٹر وینز نک کو اس چیز کی وضاحت کرنے کی پھر ضرورت ہے کہ کیوں اور کس طرح کلمہ شہادت، اذان اور اقامت دونوں کا حصہ بنا، اور اسلام میں ان کو کب شامل کیا گیا؟ مگر وہ ادھورا دعویٰ پیش کرنے کے بعد اگلے سوال کو گول کر گیا۔

مستشرقین اس بنیادی سوال سے لاتعلق نظر آتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ یا اسلامی ماخذ اسلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ان کی سوچ اور رویہ ایسا نہیں جیسا کہ عام طور پر ہونا چاہیے۔ یعنی سب سے پہلے اسلام کو اس طرح لیا جانا چاہیے جیسے وہ خود اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے اور ضرورت ہو تو وہ اسلام کے اوپر سوال اور اعتراض پیش کریں۔ لیکن اس کے برعکس ان کا مقصد مسلمانوں کو اس بات پر قائل کرنے کے لیے سارا زور صرف کرنا ہے کہ اسلام کو اسی طرح (غلط یا صحیح) سمجھا جائے جیسے

مستشرقین اسلام کو سمجھتے یا جانتے ہیں یا جس طرح کا اسلام مستشرقین خود دیکھنا چاہتے ہیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پروفیسر سی ای بوس ورتھ (Bosworth) جو کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ایڈیٹروں میں سے ایک ہیں، کولوریڈو یونیورسٹی (بولڈر، امریکہ) میں لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب میں ان سے پوچھا گیا کہ "آپ نے اس علمی کام میں مسلمان اسکالرز کو حصہ ادا کرنے سے کیوں الگ کر دیا ہے؟ حتیٰ کہ ان مسلمان اسکالروں کو بھی جن کی تعلیم و تربیت مغربی تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی، تحریری کام سے روک دیا گیا حالانکہ انسائیکلوپیڈیا کا وہ بنیادی حصہ، جس کا تعلق قرآن، حدیث، جہاد وغیرہ سے ہے، اس میں وہ لوگ بہتر معاونت فراہم کر سکتے تھے"۔ پروفیسر بوس ورتھ نے ذرا صاف گوئی سے جواب دیا: "مغربی اسکالر، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، اہل مغرب کے لیے لکھ رہے ہیں"۔ بوس ورتھ کی اس صاف گوئی کی ہم تحسین کریں گے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی تجویز کریں گے کہ انہیں جرأت سے کام لے کر اس تخلیقی کاوش کا نام بھی ایسا ہی رکھنا چاہیے مثلاً: "اہل مغرب کے لیے اہل مغرب کا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" (Encyclopaedia of Islam-by the Westerners, for the Westerners)

غور کیا جائے تو پروفیسر بوس ورتھ نے کوئی نئی بات نہیں کہی، بلکہ انیسویں صدی کے جرمن نژاد دانش ور کارل مارکس کے اس نسل پرستانہ نعرے ہی کو دوہرایا ہے، کہ: "They cannot represent themselves; they must be represented" (جو نمائندگی نہیں کر سکتے ان کی نمائندگی کی جائے)۔ (Edward Said, *Orientalism*, Vintage Books, New Yark, 1979.)

لہٰذا، اگر ایک جانب مغربی استعمار نے دوسری اقوام کے ممالک، وسائل اور علاقوں پر قبضہ جمایا تھا، تو دوسری جانب مستشرقین نے ان محکوموں کے ایمان، تاریخ، ثقافت اور شناخت کو مسخ کرنے کا کام کیا۔ دوسرے لفظوں میں مسلمانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلام کا فہم ان مستشرقین کی اسلام کے بارے میں "لاعلمی" سے حاصل کریں گے۔ (ترجمہ: پروفیسر شاہد امتیاز)

۲

ٹوبی لیسٹر نے اپنے مضمون ''قرآن کیا ہے؟'' میں ان 'امکانات' پر مسرت کا اظہار کیا ہے کہ ''آنے والے برسوں میں قرآن اور اسلامی تاریخ کی ہمہ جہت تشریحات سامنے آئیں گی..... یہ مختلف تشریحات یقیناً نزاعات کا باعث بھی بنیں گی'' --- چنانچہ لازماً ابتداء قرآن کے مطالعے سے کرنی ہوگی۔

ٹوبی لیسٹر بذات خود علوم اسلامیہ کا ماہر نہیں ہے۔ اسلام سے اس کا تعلق صرف اتنا ہے کہ وہ یمن اور فلسطین میں چند سال رہا۔ لیکن اس کا یہ تعلق اسے اس بات سے باز نہیں رکھ سکا کہ وہ اسلام کے بارے میں مغرب کے پرانے اور فرسودہ نظریات کو دوہرانے کی کوشش کرے۔ اس نے معروف ہم عصر مستشرق حضرات کو اس بات پر بھی راغب کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بغیر ہچکچاہٹ کے ان نظریات کی تشریح میں لگے رہیں۔ خصوصاً ان تازہ ترین ''دریافتوں'' یعنی ''مستند قرآن کے متن میں انحراف'' پر جرمن نژاد ڈاکٹر جوزف آر پوئن اور اس کے ایک ساتھی ڈاکٹر ہانز کیسپر گراف وان بوتھمر (مؤرخ) اسلامی آرٹ) کی کاوشوں کو موضوع بنایا جائے۔ اس عمل سے مسلم دنیا میں نظریاتی تبدیلی کی حوصلہ افزائی ہوگی اور ''تجدید پسندوں'' (revisionists) کو تقویت ملے گی۔ ٹوبی لیسٹر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ:

> مغرب میں قرآنی علوم پر تحقیق و تالیف کا علم بلا شبہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان کھلی دشمنی کے تناظر میں وجود میں آیا۔ (''مشرق'' کی تشریح کی غرض سے گزشتہ دو صدیوں کے دوران مغرب میں جو بڑی علمی تحریک روپذیر ہوئی، جسے عام طور پر ''استشراق'' (Orientalism) کہا جاتا ہے، اسے حالیہ چند برسوں میں اپنے تہذیبی اور مذہبی تعصبات کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے) ص ۴۶-۴۷۔

اپنے مضمون میں لیسٹر نے اس تعصب اور مخالفت کی چند مثالیں بھی پیش کی ہیں:

> عیسائی اور یہودی علماء کے نزدیک قرآن کفر اور بدعت [العیاذ باللہ] ہے۔ مثلاً انیسویں صدی کے مستشرق ولیم میور کا خیال تھا کہ ''قرآن تہذیب، آزادی اور سچائی کے ان سخت جانی دشمنوں میں سے ہے جن سے دنیا اب تک آشنا ہو پائی ہے''۔ ابتدائی عہد کے روسی

مفکرین نے بھی اسلام کے ماخذ کے بارے میں عیسائی مشنری جذبات کے ساتھ ہی نظریاتی تحقیق کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ایک روسی رسالے *Ateist* نے سلسلہ وار مضامین کا آغاز کیا، جن میں مارکسی اصطلاحات کے حوالے سے اسلام کے عروج کی تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔ کے ایس لیمبٹن اپنی کتاب *Islam and Russia* (اسلام اور روس، ۱۹۵۶ء) میں اس کام کا خلاصہ اس طرح بیان کرتا ہے:

''کئی روسی مفکرین نے نظریہ پیش کیا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے تاجر پیشہ بورژوا طبقہ نے نوزائیدہ مذہب اسلام کو قوت محرکہ فراہم کی''۔ ایس پی ٹالسٹوف (S. P. Tolstov) کے مطابق: ''اسلام ایک سماجی و مذہبی تحریک تھی جس کی جڑیں، جاگیردارانہ سماج میں نہیں بلکہ غلامی کی روایت رکھنے والے عرب معاشرے میں تھیں''۔ این اے موروزوف (Morozov) کے نزدیک: ''صلیبی جنگوں کے برپا ہونے تک، اسلام اور یہودیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ انہی جنگوں کے بعد اسے جداگانہ تشخص ملا، جبکہ محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] اور پہلے خلفاء [راشدینؓ] درحقیقت دیومالائی شخصیات تھیں''۔ اس طرح موروزوف ایک غیر سنجیدہ نظریہ پیش کرنے والا شخص دکھائی دیتا ہے۔ لیمبٹن اپنی کتاب *Christ* (مسیح، ۱۹۳۰ء) میں لکھتا ہے: ''قرونِ وسطیٰ میں اسلام آریائی مذہب کی محض ایک ایسی شاخ تھا جو مکہ کے نزدیک بحیرہ احمر (Red Sea) کے علاقے میں موسمیاتی عمل کے نتیجے میں پھوٹی'' (ص ۴۶، ۴۷)۔

عیسائیوں، یہودیوں، حتیٰ کہ روسی کمیونسٹوں کی روایتی اسلام دشمنی کو ٹوبی لیسٹر خود بھی تسلیم کرتا ہے۔ تاہم ایک 'غیر جانب دار اور متجسس صحافی' ہونے کے ناتے وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ ''قرآن کے متعلق امریکی ذرائع ابلاغ میں زیادہ جاندار اور وقیع بحث کیوں کم رہی ہے؟''

لیسٹر اپنی کاوش کو اسی مقصد سے منسوب کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جوزف پوئن، یمن میں بہت سے قرآنی اوراق کے بوسیدہ ٹکڑوں کو جوڑ چکا ہے اور وہ [لیسٹر] اس شاندار بحالی کے کام کو دیکھ چکا ہے۔ کسی بھی پیچیدہ حساب کی کتاب کو مرتب کرنے والا از خود حساب دان نہیں بن سکتا۔ لیکن لیسٹر کا خیال ہے کہ

پوئن جیسا شخص قرآن کے ایک مستند کتاب ہونے کی حیثیت کے بارے میں ماہرانہ رائے دے سکتا ہے۔ [یاد رہے کہ پوئن نے قاضی اسمٰعیل الاکوع کے نام اپنے خط میں اپنی عربی کمزور ہونے کا اعتراف کیا ہے] وہ قدیم اور بوسیدہ کتب کو بحال و مرتب کرنے والے اس جرمن ماہر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

پوئن کے مطابق ''بہت سے مسلمان سمجھتے ہیں کہ قرآن خدا کا غیر محرف کلام ہے۔ انہیں [مسلمانوں کو] یہ بتانا تو پسند ہے کہ بائبل کے متنی (Textual) مطالعے کے مطابق یہ کتاب تاریخی [یعنی تغیر پذیر] ہے اور سیدھی آسمان سے نہیں اتری، لیکن قرآن کو تا حال اس الزام سے مبرا سمجھا گیا ہے، اب فرق و امتیاز کی یہ دیواریں توڑی جا سکتی ہیں کہ ثابت کر دیا جائے کہ قرآن کی بھی ایک تاریخ ہے۔ صنعاء کے پارچے اس معاملے میں ہماری مدد کریں گے'' (ص ۴۴)۔

جوزف پوئن اپنے جوش و جذبے میں کوئی تنہا فرد نہیں ہے۔ قرآن پر سرگرم تحقیق کرنے والے کالگیری یونیورسٹی کے پروفیسر اینڈریو رپن بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ''یمنی مسودات کے اثرات ابھی محسوس ہونے ہیں۔ ان کی قرأتوں کا اختلاف اور آیات کی ترتیب بہت اہم ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآنی متن کی تاریخ عام گمان کے برعکس ابھی حل طلب سوال ہے اور متن اتنا مستند نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے'' (ص ۴۵)۔

جیرڈ پوئن بڑی حقارت سے اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ مسلم اور مغربی علماء نے قرآن کے روایتی مفہوم کو قبول کر لیا ہے۔ وہ کہتا ہے، ''قرآن کا اپنے بارے میں یہ دعویٰ ہے کہ وہ ایک واضح (مبین) کتاب ہے۔۔۔ لیکن اگر آپ اس کا مطالعہ کریں تو اس کا ہر پانچواں جملہ کوئی مطلب واضح نہیں کرتا۔ بہت سے مسلمان اور مستشرقین کچھ اور وضاحت کریں گے لیکن سچ یہ ہے کہ قرآن کا پانچواں حصہ ناقابل فہم ہے۔ یہی وجہ اس کے ترجمے میں روایتی مشکلات کا سبب بن گئی ہے۔ اگر قرآن قابل فہم نہیں اور اسے عربی میں بھی نہیں سمجھا جا سکتا تو پھر اس کا ترجمہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عربی زبان بولنے والے آپ کو بتائیں گے کہ اس میں تضاد ہے اور ''کچھ مزید'' کو جاننا ضروری ہے (ایضاً، ص ۵۴)۔

لیسٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ''اس '' کچھ مزید'' کی تلاش دراصل اسی صدی میں شروع ہوئی'' (ص ۵۴)۔ پھر وہ پیٹریشیا کرون (Patricia Crone) اور آر ای ہمفرے (R.E. Humphreys) کا حوالہ دیتا اور جان وانس برو (John Wansbrough) پر اپنی بات ختم کرتا ہے۔ جہاں تک وانس برو کا تعلق ہے وہ دو نکات کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مختصراً پہلا یہ کہ قرآن اور حدیث دو سو سال کے عرصے میں مرتب ہوئے۔ دوسرا یہ کہ اسلامی عقائد کی تشکیل میں عبرانی یہودی عقائد ایک نمونہ تھے۔

جوزف پوئن نئے سرے سے وانس برو کے ان پراسرار نظریات کا مطالعہ کرتا ہے، جو بہت سے پڑھے لکھے حلقوں میں متعدی بیماری کی طرح پھیل رہے ہیں۔ لیسٹر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بہت سے مسلمان ان نظریات کو پسند نہیں کرتے (ص ۵۵)۔ تاہم وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ مسلم دنیا میں بھی تجدید پسندی (revisionism) پھیل رہی ہے۔

اس حوالے سے وہ جن افراد کا تذکرہ کرتا ہے ان میں نصر ابوزید (جس کو مصر کی اعلیٰ ترین عدالت نے مرتد قرار دیا ہے)، ایک ایرانی، علی دشتی، شکاگو میں ایک مرحوم پاکستانی مستشرق ڈاکٹر فضل الرحمٰن (م: ۱۹۸۸ء)، مصر کے ہی طٰہٰ حسین، محمد عبدہٗ (م: ۱۹۰۵ء)، احمد امین اور آخر میں فرانکو الجزائری محمد ارکون اپنی اس ''سنہری نصیحت'' کے ساتھ نمایاں ہیں کہ ''قدامت پسندی (آرتھوڈوکسی) کے خلاف، انہی [مسلم معاشروں] کے اندر رہتے ہوئے لڑائی لڑی جائے''۔ (ص ۵۶)

پیٹریشیا کرون، مائیکل کک اور وانس برو گزشتہ ۲۵ برسوں سے اسلام اور قرآن کے ماخذ کے بارے میں اپنے اختراعی نظریات کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ جوزف پوئن اس گروہ کا ایک نیا رکن ہے، جس نے یمن کے مقام صنعاء میں قرآن کے قدیم اوراق کو بحال کرنے میں محنت کی ہے۔ یہاں پر لیسٹر اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتا دکھائی دیتا ہے:

> قرآن کے متن کی نئی تشریح کرنے کی لادینی کوشش، جو ایک حد تک یمنی اوراق پر منحصر ہے [راقم کو یقین ہے کہ استنبول میں اسلامی آرٹ کے عجائب گھر میں یمن سے بھی بڑے قرآنی اوراق کے ذخیرے کا امکان ہے (اعظمی)] بہت سے مسلمانوں کے لیے باعث

اذیت اور نفرت انگیز ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے بائبل اور [سیدنا] عیسیٰ [علیہ السلام] کی حیات [مبارکہ] کی ازسرنوتشریح بہت سے قدامت پسند عیسائیوں کے لیے باعث اذیت اور نفرت انگیز ہے۔ لیکن کچھ سکالر ایسے ہیں، اور ان میں مسلمان بھی شامل ہیں، جو محسوس کرتے ہیں کہ ایسی کوششیں جو قرآن کی تاریخی تعبیر پر مرکوز ہوں وہ ایک طرح کی ''تجدید'' اسلامی کا باعث ہوں گی۔ ان سے روایات کی تشکیل جدید ہوگی جو پیچھے دیکھتے ہوئے بھی آگے کی طرح قدم ہوگا۔ 'اصلاح مذہب' اور نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کی یہی گواہی ہے کہ یہ تصور جو فی الحال علمی دائرے تک محدود ہے کافی بڑے سماجی انقلاب کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ قرآن بہرکیف دنیا کی سب سے زیادہ مؤثر نظریاتی کتاب ہے۔ (ص ۴۴)

ٹوبی لیسٹر کی سوچ اور توجہات کو مختصراً درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

- قرآن نظریاتی اعتبار سے موجودہ دور کی سب سے زیادہ اثر انگیز کتاب ہے۔
- اکثر مسلمان قرآن کو اسی انداز میں دیکھتے ہیں جس طرح عیسائی، بائبل کو اب سے کم از کم دو سو سال پہلے دیکھا کرتے تھے۔
- یمنی پارچہ جات، قرآن کی ازسرنوتشریح کرنے کی لادینی کوششوں میں مددگار ثابت ہوں گے۔
- اگرچہ یہ چیز لاتعداد مسلمانوں کے لیے ناراضی اور غصے کا باعث ہے، لیکن قرآنی متن کی یہی نئی تشریح اسلامی احیاء کو ایک نیا محرک فراہم کرے گی۔ جو ایسی وسیع سماجی تبدیلیوں کا سبب بن سکتی ہے جیسا کہ اب سے دو سو سال پہلے عیسائیت کے ساتھ ہوا۔
- یہ تبدیلیاں اس امر کو سامنے لانے کا (اور ثابت کرنے کا) سبب بن سکتی ہیں کہ قرآن آغاز میں ایک تغیر پذیر (fluid) متن تھا، جس کو مسلم معاشرے نے کئی صدیوں کے دوران آزادانہ طور پر ترتیب دیا۔ گویا کہ قرآن اتنی ''مقدس'' کتاب نہیں جیسا کہ اب تک اس کو 'غلطی سے'' سمجھا جاتا رہا ہے۔

اب صورت واقعہ یہ ہے کہ ٹوبی لیسٹر کے حوالہ جات زیادہ تر غیر مسلم محققین ہی کی تحریروں پر مشتمل ہیں مثلاً جوزف پوئن، وان بوتھمر، اینڈریو رپن، اسٹیفن ہمفرے، جان وانس برو، پیٹریشیا کرون، مائیکل

کک وغیرہ ہم۔ علمی حلقوں میں یہ نام اپنے تعصبات کی وجہ سے کافی نمایاں ہیں۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اس فہرست میں کچھ ایسے مسلمان نام بھی شامل کر لیے گئے ہیں، جن کا تعلق ٹوبی لیسٹر کے مطابق ''تجدید پسند مکتب فکر'' (revisionist school) سے ہے۔ لیکن یہ ''تجدید پسند مکتب فکر'' کیا ہے؟ لیسٹر نے واضح لفظوں میں اس کی تشریح نہیں کی۔ میں یہاں پر یہودا نیوو (Yehuda Nevo) کا حوالہ دوں گا جس کو ٹوبی لیسٹر ایک معتبر نام کے طور پر پیش کرتا ہے:

> ان ''تجدید پسندوں'' (revisionists) کا انداز نظر کسی بھی طرح واحد فکری بنیاد پر قائم نہیں۔---لیکن وہ طریقیاتی بنیادوں پر اتفاق ضرور کرتے ہیں۔ وہ ان قضیوں کی تاریخی اعتباریت کا انکار کرتے ہیں جن کی بنیاد خالصتاً مسلم علمی مآخذ سے حاصل شدہ ''حقائق'' پر ہو۔--- جو اطلاعات وہ فراہم کرتے ہیں ان کی تصدیق لازماً تاریخی [آثار و] باقیات سے حاصل ہونے والے ''ٹھوس حقائق'' سے ہونی چاہیے۔---تحریری مآخذ یقیناً موجود ہوتے ہیں اور اس انداز نظر (approach) کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کبھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ نکتہ یہ ہے کہ ان [تحریری مآخذ سے حاصل شدہ] حقائق کا موازنہ خارجی شہادت سے لازماً ہونا چاہیے اور جہاں ان میں تضاد ہو، موخرالذکر کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ چونکہ مسلم علمی مآخذ سے حاصل شدہ نظریے کی تصدیق کے لیے خارجی شہادت ضروری ہے اس لیے ایسی کسی توثیق یا شہادت کی عدم موجودگی ان حقائق کی تاریخیت کے خلاف ایک اہم دلیل ہے۔ چنانچہ یہ انداز نظر اس روایتی انداز نظر سے زیادہ کشادہ (open) ہے جو 'خاموش دلیل' (argumentum-e-silentio) کو قبول کر لیتا ہے۔ اس لیے اگر ہم کسی ایسے واقعے کی خبر کو، جس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہ ہو، نظر انداز کرنے کے لیے تیار ہوں تو ہمیں لازماً یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ممکن ہے کوئی ایسی چیز موجود ہی نہ ہو جس سے اسے تبدیل (replace) کیا جا سکے، یعنی یہ واقعہ سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوا۔ کسی بھی چیز کے بارے میں ''روایتی بیان'' (traditional account) سے ہٹ کر ثبوت کی عدم دستیابی اس چیز کی عدم وقوع پذیری پر فی نفسہٖ مثبت دلیل ہے۔ ایک

نمایاں مثال یہ ہے کہ مسلم ادب و تاریخ سے باہر اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ اسلامی فتوحات کے وقت عرب مسلمان ہی تھے۔ (J.Koren and Y.D. Nevo, *Methodological Approache to Islamic Studies*, Der Islam, Band 68, Heft 1, 1991, pp. 89-92)

یہ نام نہاد ''تجدید پسندانہ'' سوچ اسلامی تاریخ کے مکمل خاتمے اور پھر اس کی جگہ ایک مسخ شدہ تاریخ پیش کرنے تک جاتی ہے۔ مثلاً اس از سر نو مرتبہ تاریخ کے مطابق ''شام میں بازنطینی سلطنت پر مسلمانوں کی فتح کی بات ایک ایسا واقعہ ہے جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا'' (ایضاً، ص ۱۰۰-۱۰۱) اور اس کے علاوہ ایسی کئی خانہ ساز ''اختراعات اور دریافتوں'' کا ذکر یہودا نیو و کرتا ہے:

> عرب اور مغربی ماہرین آثار قدیمہ نے اردن کے صحرا میں جزیرہ نما عرب اور خصوصاً حجاز کے علاقے میں وسیع پیمانے پر کھدائی کی ہے۔ انہیں یونانی، نبطی (Nabateen)، رومی اور قدیم بازنطینی آثار پر مشتمل کھنڈرات ملے ہیں۔ لیکن وہاں پر چھٹی صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک مقامی عرب تہذیبوں کی کوئی نشانیاں نہیں ملیں۔ جو چند مقبرہ نما ٹیلے اردن کے صحرا میں ملے ہیں، وہ بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتے کہ یہاں پر کسی قسم کی انسانی آبادیاں تھیں۔ ان حجازی علاقوں کے سروے کے مطابق، خصوصاً چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے جاہلانہ مشرکانہ آثار اور مشرک عبادت گاہوں کے نشانات کا کوئی سراغ نہیں ملا، جیسا کہ اسلامی ماخذ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان آثار قدیمہ کی رو سے ایسی کافرانہ پرستش جیسا کہ یہ [مسلم] ماخذ بتاتے ہیں، حجاز سے تعلق نہیں رکھتی۔ مزید برآں آثار قدیمہ کی تحقیق، مدینہ، خیبر اور وادی القریٰ میں یہودی آبادیوں کے کوئی آثار ثابت نہیں کر سکی۔ یہ دونوں نکات قبل از اسلام سرزمین حجاز کی آبادی کے حوالے سے مسلم مآخذ میں بیان کردہ منظر نامے سے براہ راست ٹکراتے ہیں۔ یہ یقیناً ایک مضبوط مگر خاموش دلیل ہے۔ لیکن اگر مسلم ماخذ میں چھٹی اور ساتویں صدی کے حجازی معاشرے کے بارے میں تاریخی حقائق محفوظ ہیں تو پھر آثار قدیمہ کی تحقیق سے کم از کم چند ایک تاریخی حوالوں کی

تصدیق تو ہونی چاہیے تھی۔ سرزمین حجاز میں ایسی شہادتوں کی عدم دستیابی اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جب ہمیں وسطی نجف کے علاقے سے، جسے مسلم ماخذ میں نظر انداز کیا گیا ہے، اسی طرح کی بہت سی شہادتیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ نجف میں ایسی عبادت گاہوں اور پتھر کی لوحوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں نبطی عہد سے لے کر آٹھویں صدی عیسوی میں عباسیوں کے دور تک بتوں کی پرستش ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہی ہے۔ حالیہ جائزوں (Surveys) اور کھدائیوں کے نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم دور کی پہلی ڈیڑھ صدی کے دوران نجف کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ مشرکوں اور بت پرستوں پر مشتمل تھا اور یہ شرک اور بت پرستی [اموی خلیفہ] ہشام کے عہد میں اپنے عروج پر تھی جب کئی مشرکانہ عبادت گاہیں تعمیر ہوئیں۔ ۱۹۸۵ء میں نجف کے زمینی سروے کے دوران اس قسم کی تقریباً ۳۰ عبادت گاہیں دریافت ہوئیں۔ یہ مشرکانہ مقامات، اپنی تعمیراتی شناخت کے لحاظ سے ان مشرکانہ عبادت گاہوں سے مطابقت رکھتے ہیں جن کا ذکر مسلمانوں کے علمی ماخذ میں ملتا ہے۔ لہذا، ان آثار قدیمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مشرک عبادت گاہیں جن کا ذکر مسلم علمی ماخذ میں کیا گیا ہے، ان کا دور جہالت کے خطہ حجاز میں تو کوئی وجود نہیں تھا لیکن ان سے ملتی جلتی ایسی ہی عبادت گاہیں وسطی نجف میں عباسیوں کے دور حکومت کے آغاز تک ضرور موجود تھیں۔ گویا جس شرک و بت پرستی (جاہلی مذہب) کا ذکر حجاز میں ہونے کے حوالے سے کیا جاتا ہے وہ دراصل بعد میں کہیں اور سے اخذ کیا گیا ہے (ایضاً ص ۱۰۱-۱۰۲)۔

اس دعوے کا مطلب یہ ہوا کہ اصلی کعبہ دراصل نجف کے صحرا میں تھا۔ ایک اہم نکتہ جس کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ان تمام ''دریافتوں'' کے پیچھے دراصل ایک خاص مقصد پوشیدہ ہے۔ اس سارے ''علم و فضل'' کا مقصد خالصتاً سیاسی ہے جسے غیر معمولی ''علمی تحقیق و دریافت'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

یہاں پر میں ایک اور مختصر کتاب (Great Confrontations in Jewish History)

کا حوالہ دینا چاہوں گا، اس مجموعہ خطبات میں ایک خطبہ کا عنوان ''جدیدیت اور یہودیت'' ہے۔ یہ خطبہ نیوجرسی کے یہودی اسکالر ربائی ڈاکٹر ہرٹز برگ نے دیا تھا۔ ہرٹز برگ کولمبیا کی یونی ورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہے۔ وہ یہودی مذہبی مقتدرہ کی مختلف ذمہ داریوں پر تعیناتی کے علاوہ امریکی یونیورسٹیوں رٹگرز اور پرنسٹن اور عبرانی یونی ورسٹی یروشلم میں بھی پڑھا چکا ہے۔ ربائی ہرٹز برگ کے خیال میں:

> امکان یہ ہے کہ، نئے دور کے بارے میں خیال تھا کہ یہ ایسا دور ہو جس میں یہودی ایک وسیع معاشرے کے اندر انضمام و تکمیل کے خواب کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ اس طرح کی کامیابی، درحقیقت الہامی کتاب میں پہلے سے بیان کی گئی مسیحانہ نجات کے مساوی ہوگی۔ (ص ۱۲۶)
>
> وہ بے ایمان یہودی جس نے عیسائیت قبول نہیں کی، پہلی دفعہ اس کا ذکر ایک اہم شخصیت کے طور پر اسپنوزا کے ہاں ملتا ہے.....[وہ] اگر اپنے اسلاف کی طرح نہیں بھی ہے تو یقیناً مذہب قبول کرنے کے بعد بھی اس کا طرزِ عمل غیر مذہبی یہودیوں (post-religious Jews) کے کئی صدیوں کے اولین نمونوں (archetype) کے مطابق ہے، جو عیسائیت قبول کرنے کے لیے اس لیے تیار نہیں، کیونکہ وہ اس [عیسائیت] پر بھی اتنا ہی کم یقین رکھتے ہیں جتنا کمزور ایمان ان کا یہودیت پر ہے (ص ۱۲۷)۔
>
> سترہویں صدی کا اسپنوزا، انیسویں صدی کے مارکس اور فرائیڈ کے لیے ایک مثال تھا۔ ان کے نزدیک بھی جدیدیت کا مطلب ان وسعتوں کی طرف سفر ہے، جو ماضی کی تنگ نظریوں اور خصوصاً یہودی معاشرے کی، گراں باریوں سے سے اوپر اٹھاتی ہیں۔ نوجوان کارل مارکس ۱۸۴۳ء میں یہودیت کے سوال پر لکھتا ہے کہ [’انسانی سماج میں] یہودی ہی اولین سرمایہ دار تھے۔ یہودیوں کے مسئلے کو سلجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ سماجی انقلاب کے ذریعے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے اس دنیا کو آزاد کرایا جائے اور اس طرح تمام انسانی معاشرے کے مسئلے کو حل کیا جائے۔ ایک اشتراکی (سوشلسٹ) معاشرے میں سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ وہ تمام پریشانیاں بھی دور ہو جائیں گی، جنہیں یہ

سرمایہ جنم دیتا ہے'۔ فرائیڈ مزید کہتا ہے کہ 'تمام مذاہب اور خصوصاً یہودی مذہب ایک طفلانہ رویے کی نمائندگی کرتا ہے۔ انسان کو لازماً صحت مند ہونا چاہیے، مگر مذہب سب سے بڑا اعصابی مرض ہے' (ص ۱۲۷-۱۲۸)۔

مارکس اس معاشرے کے معاشی اور طبقاتی ڈھانچے کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ فرائیڈ ہر فرد کا علاج کرنے کے لیے اس کے ماضی کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے: تمہاری گروہی تاریخ، تمہارے خلاف اور تمہارے اوپر ایک طاقت کی طرح مسلط ہے، جیسے انتقام لینے والا کوئی فرشتہ ننگی تلوار لیے کھڑا ہو۔ اس آسیب سے نجات ضروری ہے۔ باہر سے آنے والوں (outsiders) کی عظیم یہودی اکثریت کے ساتھ تاریخ مخالف یہ رویہ اتنے تواتر کے ساتھ کیوں روا رکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہودیوں کے ہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر جدیدیت اس خیال سے شروع ہوئی کہ اگر آپ یورپ کے زمانہ وسطیٰ کے ماضی کو بھلا سکتے ہیں تو پھر یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین برابری کی سطح پر دوبارہ شروعات ممکن ہیں۔ --- ان کی خواہش تھی کہ وہ مکمل آزادی حاصل کریں، اپنی اقلیتی بستیوں سے نکل کر مغرب میں داخل ہوں، مغربی روایات، جنہیں زیادہ تر عیسائیت نے جنم دیا تھا، کے ورثے کے بانیوں میں ان کا بھی شمار ہو، مغرب کی اساطیری داستانیں، اس کی علامتیں، اس کی عبادت گاہیں ان کا مشترک ورثہ ہو۔ یہودیوں کے لیے دنیا میں داخل ہونے کا سچا راستہ یہی تھا کہ مغرب کے ماضی کو دفن کر دیا جائے۔ تبھی روایت پسندی کے بعد کے انسانوں (post traditional men) کے لیے ممکن تھا کہ وہ نئے دور کی تعمیر برابری کی سطح پر کر سکیں (ص ۱۲۸-۱۲۹)۔

صیہونیت، کم از کم، اپنی بعض شکلوں میں، جدید یہودیت کی خود ساختہ تعریف سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہودی قومیت پر اصرار کا مطلب ایسا رویہ اور ایسا یقین ہے جو وسط انیسویں صدی کے اصلاح پسند یہودیوں کے قومیت مخالف اور کائناتی اقدار پر یقین رکھنے والے عالمی (universalist) رویے کے بالکل برعکس ہے۔ مگر یہ دو مخالف

نظریات ایک ہی سوال پوچھتے اور متضاد طریقوں سے ایک ہی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوائے چند مذہبی گرہوں کے، صیہونیوں کی اکثریت خواہ ان کا جھکاؤ سیاسی ہو یا تہذیبی، غیر مذہبی (سیکولر) ہے، جن کے خیال میں یہودی مذہب مزید یہودی وحدت کی بنیاد نہیں بن سکتا، اس لیے یہودی بقا کی پالیسی کسی اور محرک پر بنانا ہوگی۔ سب سے بڑا خدائی فرمان (حکم) اب یہ نہیں رہا کہ مذہب کی خاطر جان قربان کی جائے، بلکہ یہ ہے کہ ازسرِ نو زمین کی خاطر جنگ لڑی جائے۔ (ص ۱۳۱)

(Stanley M Wagner and Allan D Breck, *Great Confrontaations in Jewish History*, Published by Deptt. of History, University of Denvor, US)

اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیریز نے مارچ ۱۹۹۶ء میں ڈیوڈ فراسٹ کو جو انٹرویو دیا تھا، اس میں معاشروں کو ان کی تاریخ سے علیحدہ کر دینے کا یہی مقصد بہت نمایاں ہے۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

ڈیوڈ: یہ جو ایک حد تک حیران کن ہے--- کیا ہے اور یہ کب شروع ہوئی؟ میرا مطلب ہے کہ صیہونیت کی مخالفت کا ماخذ کیا ہے؟

وزیر اعظم پیریز: میں یہودی تجربے کے مختلف ہونے کے بارے میں سوچتا ہوں۔ پچھلے دو سو سال سے یہودی اپنے آپ سے یہ سوال کرتے رہے ہیں کہ ''یہودیوں سے لوگ نفرت کیوں کرتے ہیں؟'' درحقیقت اس کے دو مختلف جواب تھے۔ ایک جواب یہ تھا: ''اس لیے کہ دنیا غلط ہے، پس ہمیں دنیا کو تبدیل کرنا ہے'' اور دوسرا جواب یہ تھا: ''ہم غلط ہیں، پس ہمیں اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہے''۔ مثلاً وہ یہودی جو کمیونسٹ بن گئے، انہوں نے اس نفرت بھری دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے قدم اٹھایا اور کہا: ''آؤ ایک ایسی دنیا بنائیں جو قوموں، طبقوں، مذہبوں اور کسی ایسے خدا کے تصور کے بغیر ہو جو دوسرے لوگوں سے نفرت کا سبق دیتا ہے۔'' اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، بہت سے یہودیوں نے کمیونزم یا سوشلزم کی تشکیل میں سرگرم حصہ لیا۔ دراصل اسی وقت صیہونی آگے آئے۔ آپ جانتے

ہیں یہ واقعہ انیسویں صدی کے اختتام پر 'ڈرائی فس' مقدمہ (Dreyfus trial) میں پیش آیا، جب ایک نوجوان یہودی صحافی ہرٹزل (Hertzl) نے صیہونیت مخالف جذبات کا اظہار دیکھا اور پکار کر کہا: ''اوہ میرے خدایا، ہم دنیا کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ آؤ، ہم اپنی قسمت تبدیل کریں، آؤ ہر ایک کی طرح اپنا ملک حاصل کریں۔ آؤ، ہم خود اپنی زمین سیراب کریں، آؤ، کام کریں۔ آؤ، دفاع کریں۔ آؤ، ہم نارمل ہو جائیں۔'' یہودیوں کا کمیونسٹ روس سے یہاں (اسرائیل) آنا ہمارے لیے سب سے بڑی فتح کی بنیاد بنا۔ دانش مندی کی بات کی جائے، تو یہ ہماری قومی تاریخ کی سب سے بڑی فتح ہے'' (ڈیوڈ فراسٹ سے گفتگو، پی بی ایس-۲۹ مارچ ۱۹۹۶ء)۔

واضح طور پر ہرٹز برگ اور اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیریز جو کہہ رہے تھے وہ یہی تھا کہ صیہونی تحریک آزادی نے ایک ایسے معاشرے کا مطالبہ کیا جس کا کوئی خدا نہیں تھا، جس کا کوئی مذہب نہیں تھا اور جس کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ یہ سب کچھ اس لیے تا کہ وہ ایک وسیع معاشرے میں 'مساوی' بنیادوں پر مدغم ہو سکیں۔ مساوی طور پر بے خدا، مساوی طور پر بے مذہب اور مساوی طور پر بغیر تاریخ کے۔ چنانچہ یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ ماضی کو دفن کر دیا جائے۔

لیکن اگر تاریخ کو ختم کرنا تھا تو یہ بھی ضروری تھا کہ اس کا متبادل وضع کیا جاتا۔ چنانچہ اب ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے کہ تباہ کاروں کا ایک پورا گروہ ماضی کو کھود کھود کر تباہ کرنے کی مہم پر کام کر رہا ہے۔ جولیس ویل ہوزن (Julius Wellhausen) ان کا سرخیل تھا۔ اس نے عہد نامہ عتیق کے ارتباط و اصابت کو منتشر اور مشکوک کر دیا اور عہد نامہ جدید پر اعتراضات کا راستہ ہموار کیا اور اس گروہ کا اگلا ہدف قرآن کو ختم کرنے کی کوشش ہے۔

تمام مسلمان ممالک، بشمول عثمانی خلافت، کے علاقے جو کسی نوآبادیاتی طاقت نے ضبط کر لیے تھے یا محکوم بنا لیے تھے، ان کی محکومانہ ذہنیت مستشرقین کی ان تمام کوششوں کے لیے بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ استعماری عہد میں اصل اسلامی علماء سیاسی دباؤ اور پابندیوں کا شکار رہے جبکہ مذہبی اوقاف، جو اسلامی علم و فضل کی ترقی کے لیے اداراتی امداد فراہم کرتا تھا، کو زیادہ تر ختم کر دیا گیا یا [ان کے اثاثہ جات وغیرہ] ضبط

کر لیے گئے۔ وہ اسلامی شریعت جس نے مسلم سماج کے معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی ڈھانچے کو سہارا اور تقویت دی تھی، ختم کر دیا گیا یا بتدریج بے اثر بنا دیا گیا۔

ان محکوم ممالک میں نو آبادیاتی طاقتوں نے نہ صرف اپنی زبان، تہذیب اور تعلیمی نصاب نافذ کر دیا، بلکہ جہاں کہیں ممکن ہو سکا، وہاں کی قومی زبان کے رسم الخط تک بھی تبدیل کرنے میں تردد نہ محسوس کیا[اس کی زندہ مثال: ترکی، انڈونیشیا، ملائیشیا، تاجکستان، آذربائیجان، قازقستان، ترکمانستان، کرغیزستان وغیرہ ہیں]۔ یوں ایک عام سامراجی حکم نے تمام لوگوں کو ان کی تاریخ اور صدیوں پر پھیلے تہذیبی و علمی ورثے سے لاتعلق کر دیا اور ان کو ان پڑھ بنا دیا۔ استشراق ایک مشترکہ نو آبادیاتی اور مشنری منصوبہ تھا۔ لیکن اس میں اس وقت تیزی آئی جب صیہونی استشراق زود اثر دوا کی طرح اس میں سرایت کر گیا۔

مستشرقین اپنی مادری زبان میں لکھ رہے تھے۔ چونکہ محض چند مسلمان علما ہی یورپی زبانوں پر عبور رکھتے تھے، لہٰذا مسلمان بحیثیت مجموعی یہ نہ جان سکے کہ اسلام کے بارے میں کیا کچھ لکھا جا رہا تھا۔ پس جب بھی مسلمان علماء کو مستشرقین کے اسلام پر حملوں کے بارے میں پتہ چلتا تو وہ ان کا اپنی زبانوں میں جواب دیتے۔ جہاں تک مستشرقین کا تعلق تھا، انہیں مسلمان علماء کی کسی بحث سے کوئی سروکار نہ تھا اور نہ ہی وہ ان علماء کی تنقید کی اہمیت دینے کے لیے تیار تھے۔ وہ تو اس کوشش میں مصروف تھے کہ اپنے زیر تسلط مسلم علاقوں میں پروان چڑھنے والی نئی ٹوڈی اشرافیہ کو متاثر کر سکیں۔ اور اپنی حکومتوں اور ان اداروں پر اثر انداز ہو سکیں، جو ان کے لیے مالی امداد فراہم کرتے تھے، اور ان کے کاموں میں مدد دیتے تھے۔

وسیع سلطنت برطانیہ اور دوسری ایشیائی قوموں کے درمیان براہ راست ربط و تعلق قائم کرنے اور ان کو بہتر بنانے کے لیے مستشرقین نے مستند سفارتی نمائندوں اور ترجمانوں کی ایک باقاعدہ کھیپ مہیا کی۔ فرانس میں پہلے سے ایسا ادارہ موجود تھا جس کی اس معاملے میں نقالی کی گئی۔

ہنگری کا ایک یہودی اگنیز گولڈزیہر (Ignaz Goldziher) اپنے وقت کا ایک مشہور مستشرق تھا۔ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ماننے سے انکار کیا۔ پروفیسر ہمفرے کے الفاظ میں گولڈزیہر نے ویل ہوزن کی دلیل کو دوبارہ زندہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ 'ان احادیث کی ایک کثیر تعداد جو کہ دوسری/آٹھویں اور تیسری/نویں صدی کے مستند ترین مسلم مجموعوں میں صحیح تسلیم کی گئی ہیں، وہ

من گھڑت ہیں۔اسی طرح ان احادیث کی تائید کرنے والی بے حد محتاط اسناد بھی مکمل طور پر نا قابل اعتبار ہیں'۔

ایک جرمن یہودی مستشرق جوزف شاخت(Joseph Schacht)(م:۱۹۶۹ء)نے یہ نظریہ پیش کیا:''ان اسناد کی تدوین دوسری صدی[ہجری] کے نصف میں عباسی انقلاب سے متصل زمانے میں شروع ہوئی اوران میں سے جن اسناد کو زیادہ مکمل (perfect) سمجھا جاتا ہے ان کے جعلی ہونے کا زیادہ امکان ہے۔''اہل مغرب کے ہاں جوزف شاخت اتنا زیادہ محترم قرار پایا کہ اس کی کتاب *Origins of Muhammadan Jurisprudence* (''محمدی قانون کے ماخذ '')مستشرقین کی بائبل بن گئی حتیٰ کہ عہد نامہ کی پہلی چار کتابوں سے بھی بڑا سچ بن گئی۔امین المصری مرحوم اپنی ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے جوزف شاخت کے''ماخذ'' پر تحقیق کرنا چاہتا تھا۔مگر لندن یونیورسٹی نے اس کی درخواست مسترد کر دی اور کیمبرج میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔

سر ہملٹن ایچ اے آر گب (Sir Hamilton H.A.R. Gibb) نے اس بات کا اعلان کیا کہ''شاخت کی تحقیق مستقبل میں کم از کم مغرب کے اندر، اسلامی تہذیب اور اسلامی قانون پر ہونے والی تمام تحقیق کے لیے بنیاد بن جائے گی۔''دلچسپ بات یہ ہے کہ [معروضیت کے علم بردار] مغرب نے کسی فرد کو بھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ ایک بڑے مستشرق کی کھوکھلی علمیت کا پول کھول سکے۔

ہمفرے نے تو دوٹوک الفاظ میں کہا:''ہم آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ شاخت کا موقف صحیح ہے۔''چنانچہ صرف چند لوگوں نے ہی شاخت کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔حتیٰ کہ ان میں سے ہی ایک پروفیسر این جے کولسن (NJ Coulson) نے بڑی شائستگی سے شاخت کے مقالے کی کمزوریوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی اور ساتھ یہ اصرار بھی جاری رکھا کہ مجموعی طور پر یہ مقالہ نا قابل تردید ہے۔لیکن اس معذرت کے باوجود پروفیسر کولسن کو آکسفورڈ یونی ورسٹی چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

نوآبادیاتی حکام، اسلامی شریعت کو عوامی زندگی سے بے دخل کرنے کے بعد اس کی جگہ اپنے ملکوں کا قانونی نظام نافذ کر چکے تھے۔اب یہ مستشرقین کا کام تھا کہ وہ علمی طور پر اس چیز کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے جسے نوآبادیاتی حکومت نے مسترد کر دیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ'' قانونی احکام

بتانے والی ایک بھی حدیث مستند نہیں سمجھی جاسکتی''۔شاخت نے اسلامی قانون کے دو بنیادی مآخذ یعنی قرآن وسنت میں سے ایک [یعنی سنت] پر وار کرنے کی کوشش کی۔

جان وانس بروتو جوزف شاخت سے بھی آگے بڑھ گیا۔اس نے دعویٰ کیا کہ ''چند مستثنیات کو چھوڑ کر مسلم اصول قانون، قرآن کے مندرجات سے اخذ نہیں کیا گیا''۔شاخت نے جہاں حدیث کو اسلامی شریعت کا ناقابل اعتبار ماخذ گردانا وہاں وانس برو نے اپنے خیال میں اسلامی معاشرت اور قانون میں قرآن کی بطور مآخذ حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔اس نے بیک جنبش قلم 'الہامی مآخذ کے کتابی وجود' کو ہی سرے سے مسترد کردیا۔

جوں جوں سیاسی مقاصد تبدیل ہوتے گئے، استشراقی تحقیق کے ہدف بھی بدلتے گئے۔۱۹۵۳ء میں صیہونیوں کی جانب سے فلسطینی زمینوں پر قبضہ کرنے کے پانچ سال بعد ریورنڈ الفرڈ گوئلم (R. A. Guillaume) اس بات کو 'ثابت' کرنے کے لیے آگے بڑھا کہ ''قرآن میں جس مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے وہ دراصل مکہ کے قریب واقع ایک گاؤں جاعرانہ میں واقع تھی، اور اس کا یروشلم سے کوئی تعلق نہ تھا'' (Alfred Guillaume, *Where was al-Masjid al-Aqsa,* Al- Andalus, Madrid, 1953, pp. 323-336.)

ایک زمانے میں سر ولیم میور (William Muir) کا یہ بیان کہ ''محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کی تلوار اور قرآن —— تہذیب، آزادی اور حق کے شدید ترین دشمن ہیں، جن سے دنیا کا اب تک واسطہ پڑا ہے'' (بحوالہ M. Broomhall, *Islam in China-a neglected Problem,* 1910, p.2.) ایک الہامی جملے کی طرح تسلیم کیا جانے لگا تھا۔نہ صرف اس لیے کہ اس نے پیغمبرؐ اور قرآن کو تہذیب، آزادی اور سچ کا سب سے بڑا دشمن کہا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ''قرآن کا مصنف'' قرار دے دیا تھا۔

اس وقت سامراجی حاکموں کو یہ بات مفید مطلب لگی کہ قرآن کریم کو ایک انسانی تصنیف قرار دیا جائے۔کیونکہ اس طرح قرآن کے الہامی کتاب ہونے پر زد پڑتی تھی لیکن ولیم میور کی جانب سے قرآن کو انسانی تصنیف قرار دینے کے اس دعویٰ کی صداقت تسلیم نہ ہوسکی اور اسے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں

ناکامی ہوئی۔ اس لیے مستشرقین نے قرآن کی مسلم الثبوت حیثیت کو ختم کرنے کے لیے کچھ نئی خیال آرائیاں شروع کردیں۔

پروفیسر وانس برو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "آج جو قرآن موجود ہے، یہ ایک جماعت کی مشترکہ تحریر ہے، جو دوسو سال کے عرصے میں مسلم دنیا کے مختلف مراکز میں وجود میں آئی"۔ دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہ کہ قرآن بہت سارے نامعلوم مصنفین نے لکھا، بلکہ یہ مختلف جغرافیائی خطوں میں لکھا گیا۔

یہ نظریہ واضح طور پر مضحکہ خیز تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان پہلے آئے اور قرآن بعد میں آیا۔ ہمفرے کے الفاظ میں:

وانس برو دو بڑے نکات کو ثابت کرنا چاہتا تھا:

۱۔ اسلامی مآخذ، نہ صرف حدیث بلکہ خود قرآن بھی دوسو سال سے زیادہ عرصے پر محیط فرقہ ورانہ اختلافات کے نتیجے میں ضبطِ تحریر میں آئے اور پھر افسانوی طور پر انہیں عربی نقطۂ آغاز سے منسوب کیا گیا۔

۲۔ عمومی طور پر اسلامی عقیدہ بلکہ [حضرت] محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کا شخصی کردار بھی یہودی راہبوں کے نمونے پر تیار کیا گیا ہے۔(R.E. Humphrey, *Islamic History*, p. 85.)

اگر اس خیال کو یہودا نیوو اور جے کورن کے نقطۂ نظر کے ساتھ موازنہ کر کے پڑھا جائے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں حجاز میں کسی یہودی آبادی کا ثبوت نہیں ملتا، تو وانس برو کے مفروضے کی صیہونی تعبیر بے حد اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ اسلام کے ظہور کے وقت سرزمین حجاز میں کوئی یہودی موجود نہیں تھے، تو یہ خود بخود ہی ثابت ہو جائے گا کہ قرآن نہ تو محمد صلی اللہ علیہ و سلم نے تصنیف کیا اور نہ ہی یہ ان پر نازل ہوا۔ اور اگر حقیقت میں قرآن کو مختلف فرقہ درانہ حلقوں نے دوسو سال سے زائد عرصے میں تیار کیا ہے تو پھر واضح طور پر یہودیوں اور بنی اسرائیل کے بارے میں جو کچھ بھی قرآن میں درج ہے نہ تو اس کی کوئی اعتباریت ہے اور نہ ہی اس کا کوئی جواز ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ صیہونی نقطۂ نظر سے اس کا کیا مطلب ہوگا؟

سب سے پہلا مقصد تو یہ کہ اسلام، دینِ ابراہیمی کا تسلسل نہیں ہے نہ ہی اس دین کی تکمیل کرتا ہے

اور نہ ہی قرآن، خدا کی آخری الہامی کتاب ہے۔ دوسرا یہ کہ یہودی اس ممکنہ پریشانی سے بچ جائیں، جو قرآن کے اس تنقیدی اسلوب سے پیدا ہوتی ہے، جو وہ ابتدائی تاریخ میں بنی اسرائیل کے غیر یہودی رویے کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔

اپنی سابق معاندانہ اور متعصّبانہ کوششوں کی اہمیت اور معقولیت سے خود بھی قائل نہ ہونے کے بعد آج کے مغربی ماہرین اپنے تاریخی لقب ''مستشرقین'' سے کتراتے ہیں۔ اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کو اسلامیئین (Islamicist) کہا جائے۔ یہ لوگ قرآن کی صداقت اور حقانیت کو نقصان پہنچانے کے اپنے منصوبے کو اپنے شاگردوں یعنی نام نہاد مسلم تجدید پسندوں (revisionists) کے ساتھ مل کر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ایک ولندیزی (ڈچ) اشاعتی اوارے برل (Brill) نے بہت سے یہودی، عیسائی، مسلمان دہریوں اور اپنے مخصوص معیار پر پورا اترنے والے دوسرے ''ماہرین'' کو اکٹھا کیا ہے، کہ دو جلدوں پر مشتمل *Encyclopaedia of the Quran* (قرآنی انسائیکلوپیڈیا) تخلیق کیا جا سکے۔ دو سال کی مختصر مدت کے اندر اس منصوبے کو مکمل کرنے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہوگی اگر یہ 'انسائیکلوپیڈیا' مسلمانوں کو قرآن سمجھانے کی ایک اور ایسی کوشش نہ ہو جس طرح کہ یہ مستشرقین اور تجدید پسند انہیں سمجھانا چاہتے ہیں۔ (ترجمہ: شاہد امتیاز/سلیم منصور خالد)

۳

اب تک ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ٹوبی لیسٹر اپنے مضمون میں اپنی کن خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس نے اپنے مضمون میں قرآن پاک کے ایک قدیم نسخہ کی ''دریافت'' کو بنیاد بنایا ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ نسخہ ابتدائی دو ہجری صدیوں سے متعلق ہے۔ اس نسخہ کے چند بوسیدہ اوراق میں قرآن پاک کے مسلمہ معیاری متن سے معمولی سے فرق کو سامنے رکھ کر اسلام کی ''اصلاح وتجدید'' کی پوری عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دراصل دین اسلام کو مسخ کرنے کا یہ وہی خواب ہے، جو خود

عیسائیت کی مقدس کتابوں کے پے در پے ایڈیشنوں کی شکل میں پورا ہو چکا ہے۔اب اسلام کے بارے میں تحریف وانحراف کے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے اس ذہن کی بے چینی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اسی تناظر میں مذکورہ ''دریافت'' کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی کوششوں کی سمجھ بھی آتی ہے۔

ٹوبی لیسٹر نے کسی عالم یا ناقد صحافی کے حوالے کے بغیر اپنے دلائل کا تمام تر انحصار جوزف پوئن پر کیا ہے۔اگر چہ بیان میں تھوڑی سی تکرار ہوگی، تاہم مضمون کو تازہ کرنے کے لیے پوئن کی ''دریافت'' سے لیسٹر نے جو نتائج اخذ کیے ہیں، ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔ یمن سے دریافت ہونے والے قرآن کے مختلف صفحات سے پہلی بات یہ اخذ کی گئی ہے کہ موجودہ قرآن کا متن اللہ تعالیٰ کی اس وحی پر مشتمل نہیں ہے، جو ساتویں صدی عیسوی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، بلکہ یہ بعد میں بتدریج وضع کیا گیا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے الفاظ پر مشتمل ہے جس میں کوئی لفظی تبدیلی نہیں ہوئی۔لیسٹر کا کہنا ہے کہ بائبل کا متن بھی آسمانی نہیں بلکہ اس کی ترتیب و تدوین کی پوری ایک تاریخ ہے مگر قرآن کے بارے میں اس طرح کا کوئی سوال زیر بحث نہیں آیا۔جوزف پوئن کے نزدیک قرآن کے بارے میں اس طرح کے طرز فکر کی بنیادوں کو منہدم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ وہ ہے قرآن کے بارے میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش، کہ بائبل کی طرح اس کی ترتیب و تدوین اور ارتقا کی بھی ایک تاریخ ہے۔یمن کے دارالحکومت، صنعا سے دریافت کردہ نسخے اس منصوبے کو آگے بڑھانے میں مددگار ہیں۔

یہ باتیں جوزف پوئن نے ٹوبی لیسٹر کے ذہن میں پوری طرح بٹھا دی ہیں۔مگر جوزف پوئن خود قاضی اسماعیل الاکوع کو خط لکھنے میں قدرے محتاط بلکہ خاصا لطیف پیرایۂ اظہار اختیار کرتا ہے۔قاضی اسماعیل الاکوع جمہوریہ یمن میں نوادرات اور لائبریریوں کی تنظیم کے منتظم اعلیٰ ہیں۔انہوں نے ہی جوزف پوئن کو ایک قدیم مسجد میں مدفون قرآنی نسخوں کی بحالی اور مطالعے کی اجازت دی تھی۔

پوئن نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ٹوبی لیسٹر کے مضمون کی اشاعت کے بعد صنعا کے لوگوں میں آثار و نوادرات کے محکمے کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے اور سرکاری حکام معاملے کو رفع دفع

کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

جوزف پوئن کا موقف ہے کہ ''میں اپنے ساتھی محقق ڈاکٹر گراف وان بوتھمر کے ساتھ مل کر قرآن پر سار بروکن یونی ورسٹی جرمنی میں جو تحقیق کر رہا ہوں، اس کے خلاف ذرائع ابلاغ میں جاری مہم بے بنیاد ہے''۔

پوئن کے بقول وہ امریکی مضمون نگار لیسٹر کو ذاتی طور پر نہیں جانتا، البتہ اس کی موصوف کے ساتھ متعدد بار ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی ہے۔ جہاں تک صنعا سے دریافت ہونے والے قرآنی مصحف کے بارے میں اس کی اپنی رائے کا تعلق ہے، اس بارے میں پوئن کا کہنا ہے کہ ''یہ عام طرح کے متن ہیں اور ان میں کوئی چیز نئی، حیران کن اور نقصان دہ نہیں''۔

بقول پوئن: ''یہ بات اہم ہے اور خدا کا شکر ہے کہ قرآن کے یمنی نسخوں اور دنیا بھر کے کسی بھی عجائب خانے میں محفوظ نسخوں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ تلفظ اور ہجوں کا معمولی اختلاف اپنی جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف قاہرہ سے شائع شدہ قرآن میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے: **ابرهیم** اور **ابرهم** یا **قرآن** اور **قرن** **یاسیماهم** اور **سیمهم**۔ پھر یمن کے قدیم قرآنی نسخوں میں حرف علت کے طور پر الف لکھنے کی روایت نہیں تھی''۔

قاضی اسماعیل الاکوع کو جوزف پوئن کے معاون ڈاکٹر گراف وان بوتھمر کا ایک اور خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۹۹ء کو موصول ہوا۔ اس میں لکھا ہے: ''[مجھے] یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا ہے کہ امریکی رسالے (**دی اٹلانٹک**) میں شائع شدہ مضمون، یمن میں لوگوں میں غم وغصہ کا باعث ہوا ہے۔ اس مضمون میں میرے اور ڈاکٹر جوزف پوئن کے اس کام کا ذکر ہے جو ہم صنعا میں کر رہے تھے۔--- یہ ایک واضح امر ہے کہ قرآنی مخطوطات پر ہماری تحقیق و مطالعے کا کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ نہ ہی ضبط تحریر میں لائی جانے والی وحی پر اس کا مستقبل میں کوئی اثر ہو سکے گا''۔

ڈاکٹر ہینز کیسپر (Hans - Casper) کے بقول: ''یہ خیال مضحکہ خیز ہے کہ میں نے اپنے تحقیقی کام کی نوعیت کو یمنی حکام سے خفیہ رکھنے کی کوشش کی..... صنعاء میں میرے کام سے شناسا کوئی شخص عملی یا علمی طور پر اس گمان سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے میرے تحقیقی کام کے بارے میں ہر طرح کے شکوک و

شبہات ختم ہو جانے چاہییں''۔

ہینز کیسپر، گراف وان بوتھمر سچ کہتے ہوں گے۔ مگر ان میں سے زیادہ سچا کون ہے اور کون نہیں؟ ٹوبی لیسٹر؟ یا جوزف پوئن؟ اور وان بوتھمر؟ شاید ان سب نے ہی سچ کو پورا بیان نہیں کیا۔

جوزف پوئن کے حوالے سے ٹوبی لیسٹر اس کی دور اندیشی بیان کرتا ہے: ''یمن کے حکام اس معاملے کو اچھالنا نہیں چاہتے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں تاہم اس کی وجوہ مختلف ہیں''۔

ٹوبی لیسٹر نے جوزف پوئن کے حوالے سے مزید لکھا کہ ''[یمنی حکام] شائد مسلمانوں کو یہ بتانا پسند نہیں کریں گے کہ بعض جرمن اور دوسرے افراد اس مواد پر کام کر رہے ہیں کیونکہ مسلمانوں کو پوزیشن یہ ہے کہ قرآنی تاریخ کے متعلق جو کچھ بتایا جانا تھا ہزار سال پہلے بتایا جا چکا ہے''۔

ٹوبی لیسٹر کے خیال میں اسی وجہ سے جوزف پوئن اور وان بوتھمر نے دریافت شدہ پارچہ جات میں سے بہت مختصر سا مواد شائع کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ابھی تک مواد کی چھانٹی اور ترتیب میں لگے ہوئے ہیں، جس کے مکمل ہونے کے بعد وہ اس کا منظم مطالعہ کریں گے۔ اسی مرحلے پر بات زیادہ عام ہو جانے سے یمنی حکام دریافت شدہ نسخوں تک رسائی روک سکتے ہیں۔

وان بوتھمر ۱۹۹۷ء میں ان یمنی پارچہ جات کی ۳۵۰۰۰ مائکروفلمیں تیار کر کے جرمنی لے آیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جوزف پوئن، وان بوتھمر اور دوسرے ماہرین کے پاس یہ موقع موجود ہے کہ وہ اپنے مطالعے کے نتائج کی آزادانہ اشاعت کر سکیں۔

اس ٹیم کے کام نے یمن کے دارالحکومت صنعا میں شدید بے چینی پیدا کر دی، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے جوزف پوئن اور وان بوتھمر نے قاضی اسماعیل الاکوع کو خطوط لکھے۔ مگر وان بوتھمر نے اپنے خط کی زبان میں بڑی چابک دستی سے کام لیا ہے۔ وہ قاضی الاکوع کو اطمینان دلاتے ہوئے کہتا ہے: ''جہاں تک میں جانتا ہوں قرآن کی اسلام سے قبل کوئی تاریخ نہیں''۔ مطلب یہ ہوا کہ: 'دراصل ان کی تحقیق کا مرکز قرآن کی مابعد اسلام تاریخ وتدوین ہے' یہ بالکل وہی بات ہے جو مستشرقین ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نزول کے بعد قرآن ارتقاء کے کچھ مخصوص مرحلوں سے گزرنے کے بعد موجودہ استحکام اور معیار تک پہنچا ہے، اور ان کے خیال میں یمنی پارچوں سے اس بات کو تقویت ملتی ہے ___ اس وجہ سے ہی قاضی اسماعیل کے

ساتھ خطوط میں محتاط معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے اور ان سب چیزوں کو غیر نمایاں یا دھیما (low profile) رکھنے کی خواہش ظاہر کی گئی۔

بلاشبہ ٹوبی لیسٹر، جوزف پوئن اور وان بوتھمر کوئی ایسے لوگ نہیں ہیں کہ جنہوں نے اس نوعیت کی یاوہ گوئی کی پہلی کوشش کی ہے اور نہ ان پر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اس طرح کی کوششیں ہمیشہ سے جاری ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ عظیم اسلامی اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف **خطبات بھاولپور** میں اس حوالے سے ایک مخصوص کوشش اور اس کے نتائج کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

> گزشتہ صدی کے اوائل میں جرمنی میں میونک [میونخ] یونیورسٹی میں ایک ادارہ قائم کیا گیا ''قرآن مجید کی تحقیقات کا ادارہ''۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا سے قرآن مجید کے قدیم ترین دستیاب نسخے خرید کر، فوٹو لے کر، جس طرح بھی ممکن ہو، جمع کیے جائیں۔ جمع کرنے کا یہ سلسلہ تین نسلوں تک جاری رہا۔ جب میں ۱۹۳۳ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس کا تیسرا ڈائریکٹر پریتسل (PRETZL)، پیرس آیا تھا تاکہ پیرس کی پبلک لائبریری میں قرآن مجید کے جو قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے فوٹو حاصل کرے۔ اس پروفیسر نے مجھ سے شخصاً بیان کیا کہ اس وقت (یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے) ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں قرآن مجید کے بیالیس ہزار (۴۲۰۰۰) نسخوں کے فوٹو موجود ہیں، اور مقابلے (Collation) کا کام جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر ایک امریکی بم گرا اور عمارت، اس کا کتب خانہ اور عملہ سب کچھ برباد ہو گیا۔ لیکن جنگ کے شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ایک عارضی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلہ کا جو کام ہم نے شروع کیا تھا، وہ ابھی مکمل تو نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافات روایت ایک بھی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی جو غلطی ایک نسخے میں ہوگی وہ کسی دوسرے نسخوں میں نہیں ہوگی۔ مثلاً فرض

کیجیے ''بسم اللہ الرحیم ''میں ''الرحمن '' کا لفظ نہیں۔ لیکن یہ صرف ایک نسخے میں ہے۔ باقی کسی نسخے میں ایسا نہیں ہے، سب میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم '' ہے۔ اس کو ہم کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ یا کہیں کوئی لفظ بڑھ گیا ہے، مثلاً ایک نسخے میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم '' ہے باقی نسخوں میں نہیں ہے، تو اسے کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کہیں کہیں سہو قلم یعنی کتابت کی غلطی سے ملتی ہیں۔ لیکن اختلاف روایت، یعنی ایک ہی فرق کئی نسخوں میں ملے، ایسا کہیں نہیں ہے۔ یہ ہے قرآن مجید کی تاریخ کا خلاصہ، جس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں خدا کا جو فرمان ہے۔ ''ان نحن نزلنا و انا له لحافظون ''(ہم ہی اسے نازل کرتے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے) یہ تمام واقعات جو میں نے آپ سے بیان کیے، اس آیت کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں (خطبات بهاولپور ، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، اشاعت پنجم ۱۹۹۷ء، ص ۲۰-۲۱)۔

قرآن کریم یہ بھی کہتا ہے کہ ہدایت ان کے لیے ہے جو اس کے طالب ہوں گے۔ چونکہ قرآن کے نزول کے پہلے دن ہی سے یہ کہہ دیا گیا ہے، لہٰذا یہ فرمان ہمارے فہم اور ذہانت دونوں کے لیے چیلنج ہے۔ یہ چیلنج ماضی میں بھی ہر دور کے لیے تھا اور آنے والے زمانوں میں بھی درپیش رہے گا۔

مستشرقین یا اسلامیئین کے کام کی نوعیت، معیار، ان کے ارادوں، مقاصد اور قابلیتوں کے مختصر تذکرے بعد یہ ضروری ہے کہ ان بنیادی سوالات کو واضح کر دیا جائے جو قرآن کے حوالے سے کسی بھی بحث یا مطالعے میں ہماری راہنمائی کریں۔ یہ سوالات اس طرح ہیں:

- پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن کیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ قرآن، اللہ کی جانب سے انسانیت کے نام آخری پیغام ہے۔ یہ پیغام بلا امتیاز نسل، زبان اور رنگ کے ہر دور کے انسان کے لیے ہے۔ چونکہ یہ پیغام اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں ہے، لہٰذا اس کے ساتھ تاریخ کا سوال لایعنی ہے۔ یہ دائمی ہے۔ یہ زمان و مکان کی قید سے بے نیاز ہے۔ یہ کتاب تحریر و حافظہ دونوں صورتوں میں بغیر کسی تبدیلی، تحرف، حشو و زوائد اپنی اصل زبان اور اصل شکل میں

محفوظ کی گئی ہے۔

● دوسرا سوال ہے: فرض کریں اگر کچھ اوراق یا کتاب کا پورا نسخہ، حال یا مستقبل میں اس کے قرآن ہونے کے دعویٰ کے ساتھ دریافت کیے جائیں، اور ان میں اور موجودہ قرآن کے نسخوں میں فرق پایا جائے تو ایسی صورت حال کا قرآن کے متن پر کیا اثر ہوگا؟

اس کا صاف جواب یہ ہے کہ کوئی اثر نہیں ہوگا۔ قرآن کا کوئی ایسا نسخہ کسی بھی شکل میں دریافت نہیں ہوسکتا جو اس قرآن سے مختلف ہو، جو ہمارے پاس چودہ صدیوں سے ہے۔ اگر کوئی نسخہ ہمارے ہاتھوں میں موجود قرآن سے مختلف ہوگا تو اسے قرآنی متن تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ کسی بھی متن کے قرآنی متن ہونے کے لیے بنیادی معیار ہی یہ ہے کہ وہ **مصحف عثمانی** سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہو۔

● تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن کی تعبیر کا حق دار کون ہے؟ مسلمانوں کے لیے اس کی تفسیر اور توجیہ کون کرے گا؟ کون بتائے گا کہ وہ کس بات کو اختیار کریں اور کس کو چھوڑیں؟ عربی زبان، مسلم تمدن اور مسلم تاریخ اور تہذیب کے بارے میں نفس ناطق کون ہوں گے؟

اس کا جواب ہے کہ: صرف ایک عالم باعمل، خوفِ خدا رکھنے والا مسلمان ہی اسلام یا اسلامی مسائل پر لکھنے کا حق رکھتا ہے اور بعدازاں ان کے رشحات فکر کو حقائق اور مسلمہ اصولوں پر پرکھا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے اسلام کی کوئی بھی ایسی تعبیر، توضیح، تصریح یا تشریح، جو کسی غیر مسلم، یہودی، عیسائی، ملحد یا حتیٰ کہ کسی بے عمل مسلمان نے کی ہو، اسے وہی تصور کیا جائے گا جو کہ وہ ہے، یعنی، جائز یا حقیقی انتقاد یا متعصّبانہ تنقید اور حاشیہ آرائی، یا حقیقی غلط فہمیاں، لیکن اسے کبھی بھی ''متبادل اسلام'' کے طور پر تصور یا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ (ترجمہ: محمد یوسف/ اسلام خان)